وحدتِ ادیان کا باطل تصور
سورۃ البقرۃ کی آیت ۶۲ کی آڑ میں

ڈاکٹر اسرار احمد

تمہید

قرآن حکیم کے بالکل آغاز میں مکی اور مدنی سورتوں کا جو پہلا گروپ ہے اس میں مکی سورت صرف سورۃ الفاتحہ ہے' جو اگرچہ قامت میں تو بہت مختصر ہے لیکن قیمت میں بہت گراں قدر ہے۔ اس کے بعد چار سورتیں مدنی ہیں' ان میں پہلی سورۃ البقرۃ ہے جو قرآن حکیم کی طویل ترین سورتوں میں سے ایک ہے۔ اس میں دو مضامین کی لڑیاں تسلسل کے ساتھ چلتی ہیں۔ ایک تو اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ دونوں پر اتمامِ حجت ــــــ اس لئے کہ مکی قرآن میں اصل مخاطب مشرکین عرب تھے اور ان پر دعوت کا حق ادا کر کے ہر طرح سے اتمامِ حجت ہو چکا تھا۔ اگرچہ مکی دَور کے آخری حصہ میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں اہل کتاب کی طرف بھی حوالہ تھا' چنانچہ سورۃ الاعراف میں نمایاں طور پر روئے سخن اہل کتاب کی طرف ہے' لیکن ان سے اصل خطاب نبی اکرم ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد شروع ہوا ہے۔ لہٰذا ان چار سورتوں (البقرۃ تا المائدۃ) کا مسلسل ایک مضمون ہے' یعنی اہل کتاب کو دعوت' ان پر اتمامِ حجت اور ساتھ ہی ملامت۔ اللہ کے دین اور اس کی عطا کردہ نعمت کے ساتھ ان کا جو طرزِ عمل رہا' اس کی بنا پر ان پر فردِ جرم عائد کی گئی ہے۔

سورۃ البقرۃ میں جو دوسرا مضمون تسلسل کے ساتھ چلتا ہے' جس کا نقطۂ آغاز سورۃ البقرۃ اور نقطۂ عروج سورۃ المائدۃ ہے' وہ شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے۔

مکی سورتوں میں ایمان کے مضامین بیان ہوئے ہیں یا پھر انبیاء و رُسل کے حالات جو

© rasailojaraid.com

بہت ہی تکرار کے ساتھ آئے ہیں۔ ان میں بنیادی انسانی اخلاقیات کا مضمون بھی آیا ہے' لیکن شرعی احکامات اصلاً مدینہ منورہ ہی میں آئے ہیں جہاں ان کی تنفیذ ہو سکتی تھی۔ چنانچہ سورۃ البقرۃ سے ان کا آغاز ہوا اور سورۃ المائدۃ میں تکمیل ہوئی۔

اب سورۃ البقرۃ جو ہمارے زیرِ مطالعہ ہے' اس کے بارے میں چند باتیں نوٹ کرلیں۔ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے ہجرت کے بعد نازل ہونے والی یہ پہلی سورۃ ہے' اگرچہ اس کا نزول اس طور سے نہیں ہوا ہے کہ پوری سورۃ ایک بار نازل ہوگئی ہو۔ حجم کے لحاظ سے یہ قرآن مجید کی عظیم ترین سورۃ ہے اور اس کی عظمت صرف حجم کے لحاظ سے ہی نہیں' بعض دیگر اعتبارات سے بھی ہے۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ ؓ نے حضور نبی اکرم ﷺ کا فرمان مبارک نقل کیا ہے' جسے جامع ترمذی میں روایت کیا گیا ہے کہ ''ہر شے کی ایک چوٹی ہوتی ہے اور قرآن حکیم کی چوٹی سورۃ البقرۃ ہے''۔ یہ سورۂ مبارکہ وقفے وقفے سے تھوڑی تھوڑی آیات کی شکل میں ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر کے متصلاً قبل تک نازل ہوئی۔ اگرچہ غزوۂ بدر سے قبل سورۃ البقرۃ کے علاوہ سورۂ محمد (ﷺ) بھی نازل ہوئی ہے' جس کا دوسرا نام سورۂ قتال ہے' لیکن اکثر و بیشتر وہ آیات جو ہجرت کے بعد سے لے کر غزوۂ بدر تک نازل ہوئی ہیں' اس سورۂ مبارکہ میں جمع کی گئی ہیں' اگرچہ چند ایک مستثنیات ہیں۔ سود یعنی ربا سے متعلق آخری آیات سن ۹ ہجری میں نازل ہوئی تھیں لیکن انہیں اس سورۃ میں شامل کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس سورۂ مبارکہ کی آخری دو آیات زمین پر نہیں بلکہ معراج میں اُمت کے لئے تحفہ کے طور پر عطا ہوئی ہیں۔

اس سورۃ کے مضامین کے تجزیہ کے ضمن میں مَیں نے اسے ''**سورۃُ الاُمَّتَین**'' کا نام دیا ہے' یعنی یہ دو اُمتوں کی سورۃ ہے' اس میں سابقہ اُمت بنی اسرائیل اور موجودہ اُمت مسلمہ' دونوں سے خطاب ہے۔ چنانچہ نمایاں طور پر اس کے دو حصے ہیں' جو تقریباً مساوی ہیں' گو آیات کی تعداد میں قدرے فرق ہے۔ پہلے حصے میں ۱۵۲ آیات اور ۱۸ رکوع ہیں جبکہ دوسرے حصے میں ۱۳۴ آیات اور ۲۲ رکوع ہیں۔ گویا پہلا حصہ آیات

© rasailojaraid.co

کے اعتبار سے بھاری ہے جبکہ نصف ثانی میں رکوعوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ یہ سورۃ تقریباً دو برابر حصوں میں منقسم ہے۔ سورۃ الفاتحہ کے بارے میں تو ایک حدیث قدسی کی رو سے اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ((قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ)) ''میں نے نماز (مراد سورۃ الفاتحہ) کو اپنے اور بندے کے درمیان دو برابر حصوں میں تقسیم کر لیا ہے۔'' اسی کا عکس یا پرتو سورۃ البقرۃ ہے جو سورۃ الفاتحہ کے فوراً بعد شروع ہو رہی ہے اور اسے بھی اللہ نے دو برابر برابر حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے حصہ میں اصل روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہے جبکہ دوسرے حصہ میں تمام تر خطاب اُمتِ محمدؐ سے ہے۔ اس کی مزید تقسیم کے بارے میں مَیں ''قرآن حکیم کی سورتوں کا اجمالی تجزیہ'' نامی کتاب میں لکھ بھی چکا ہوں' یعنی پہلے حصہ میں ایک عمودی تقسیم ہے کہ پہلے ۴' پھر ۱۰ اور اس کے بعد پھر ۴' کل ۱۸ رکوع۔ اور چار ہی مضامین کی لڑیاں نصف ثانی میں چلتی ہیں جو آپس میں بٹی ہوئی ہیں۔ یہ گویا افقی (horizontal) تقسیم ہو گی۔ یعنی ایک تو شریعت کے احکام جو اوّلاً عقائد و ایمانیات اور ثانیاً عبادات و معاملات اور اوامر و نواہی وغیرہ پر مشتمل ہیں' دوسرے اللہ کی راہ میں جہاد جس کی دو شاخیں جہاد بالمال یعنی انفاق فی سبیل اللہ اور جہاد بالنفس یعنی قتال فی سبیل اللہ ہیں۔ یہ چار لڑیاں ہیں جو نصف ثانی میں چلتی ہیں اور آپس میں بٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہاں آپ ان مضامین کو رکوعوں میں تقسیم نہیں کر سکتے' کیونکہ یہ لڑیاں مسلسل چلتی ہیں' مگر آپس میں بٹی ہونے کی وجہ سے پہلے ایک مضمون آئے گا' پھر دوسرا' تیسرا' چوتھا اور پھر پہلا۔ جیسے چار مختلف رنگ کی ڈوریاں ہوں' انہیں اگر رسّی کی شکل میں بٹ دیا جائے تو ایک طرف سے دیکھنے پر چاروں رنگ کٹے پھٹے نظر آئیں گے لیکن رسّی کو کھول دیا جائے تو ہر ڈوری مسلسل نظر آئے گی۔ اس طرح چار مضامین کی ڈوریاں اگرچہ اپنی جگہ مسلسل ہیں لیکن چونکہ انہیں بٹ دیا گیا ہے' اس لئے ان میں تسلسل دکھائی نہیں دیتا' حالانکہ معنوی تسلسل موجود ہے۔

© rasailojaraid.co

جہاں تک پہلے حصہ کا تعلق ہے اس کے پہلے چار رکوع تمہیدی اور آخری چار رکوع تحویلی ہیں' جبکہ درمیان کے دس رکوعوں میں براہِ راست بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ پہلے چار رکوعوں میں سے ابتدائی دو رکوعوں میں تین قسم کے انسانوں کی تقسیم ہے' یعنی وہ جنہوں نے قرآن حکیم سے صحیح استفادہ کیا' اس پر ایمان لائے' اس سے انہوں نے اپنے قلوب واذہان کو بھی منور کیا اور اپنے سیرت وکردار کو بھی مزین کیا۔ دوسرے وہ جو تکبر' ضد اور حسد کی بنا پر اس کے انکار اور کفر پر اَڑ گئے اور تیسرے وہ جو بین بین رہے اور جن کی زیادہ تفصیل دوسرے رکوع میں آئی ہے' اس لئے کہ یہ تیسرا طبقہ ہی تھا جو ہجرت کے بعد مدینہ میں نمایاں طور پر سامنے آیا' مکہ مکرمہ میں یہ تیسرا طبقہ موجود نہیں تھا' اگر تھا بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ بعد کے دو رکوعوں میں قرآن کی دعوت اور قرآن کا بنیادی فلسفہ بیان ہوا ہے' گویا کل قرآن کا لب لباب ہے جو سورۂ بقرہ کے تیسرے اور چوتھے رکوع میں ہے۔ دعوت کے اعتبار سے تیسرا اور فلسفہ وحکمت کے اعتبار سے چوتھا رکوع اہم ہے۔ یہ چاروں رکوع تمہیدی ہیں۔

اس کے بعد بنی اسرائیل سے خطاب شروع ہوتا ہے۔ ان دس رکوعوں میں جو تقسیم ہے وہ بعد میں بیان کی جائے گی۔ ان کے بعد چار رکوع تحویلی ہیں' یعنی جن میں تحویل قبلہ کا حکم ہے' اور تحویل قبلہ دراصل اس بات کی علامت تھی کہ سابقہ اُمت مسلمہ کو' جس کا مرکز یروشلم رہا' معزول کر کے اب ایک نئی اُمت' اُمت محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی تاسیس ہوئی ہے' جس کا مرکز بیت اللہ ہے۔ گویا سابقہ اُمت مسلمہ بنی اسرائیل کو جسے دو ہزار سال تک اللہ کی نمائندہ اُمت ہونے کا شرف حاصل رہا' اب اس منصب سے معزول کیا جا رہا ہے اور ایک نئی اُمت' جو محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی بنیاد پر وجود میں آئی ہے' اب اسے اس روئے ارضی پر اس مقام پر فائز کیا جا رہا ہے اور یہ مقام اسے اب تاقیامِ قیامت حاصل رہے گا۔

سورۂ بقرہ کے پندرہویں اور سولہویں رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو نمایاں کیا گیا ہے' اس لئے کہ خانۂ کعبہ جسے اس نئی اُمت کا مرکز بنایا جا رہا ہے' کی تعمیر

© rasailojaraid.com

حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے کی تھی۔ ان کے بعد ۱۷ اور ۱۸' دو رکوع تحویل قبلہ سے متعلق ہیں۔

اب درمیان کے دس رکوع (۵ تا ۱۴) جن میں بنی اسرائیل سے خطاب ہے' ان میں جو اہم نکتہ ہے اسے اچھی طرح سمجھنے کے لئے اس حصہ کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر لیں۔ پہلے (پانچویں) رکوع کی ۷ آیات بنی اسرائیل کو محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کی پرزور دعوت پر مشتمل ہیں۔ بنی اسرائیل سے خطاب کے ذیل میں یہ سات آیات گویا بمنزلہ ''فاتحہ'' کے ہیں۔ سورۂ فاتحہ کی بھی سات آیات ہیں' اسی طرح بنی اسرائیل کو دعوت کے ضمن میں یہ سات آیات بہت ہی اہم ہیں۔ اس کے بعد بقیہ ۹ رکوعوں (۶ تا ۱۴) کے شروع اور اختتام پر بھی دو دو آیات بالکل انہی معنوں میں ہیں۔ چھٹے رکوع اور پھر پندرہویں رکوع کی پہلی آیت کا آغاز انہی الفاظ میں ہوا ہے جو پانچویں رکوع کے آغاز میں آئے ہیں' یعنی ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ﴾

چھٹے رکوع کی پہلی دو آیات اور پندرہویں رکوع کی پہلی دو آیات گویا ریاضی کے بریکٹس کے مانند ہیں اور اس طرح یہ ۹ رکوع بریکٹس کے اندر شمار ہوں گے۔ بریکٹس کے اندر کا تمام تر حصہ بنی اسرائیل کی ملامت پر مشتمل ہے جس میں ان کے جرائم اور ان پر عائد فرد جرم کا تذکرہ ہے۔ چنانچہ ریاضی کے اصول کی رو سے بریکٹس کے اندر کے ۹ رکوع (۶ تا ۱۴) شروع کے رکوع نمبر ۵ کی سات آیات کے تابع تصور ہوں گے۔ یہ باتیں یہاں اس لئے دہرائی جارہی ہیں تاکہ زیر بحث آیات کے سمجھنے میں آسانی ہو۔

ایک بات مزید نوٹ کر لیجئے کہ اس سے قبل ہم چھٹے اور ساتویں رکوع کا مطالعہ مکمل کر چکے ہیں جن میں بنی اسرائیل کی تاریخ کے بہت سے واقعات کا تذکرہ ہوا ہے اور ان کے طرز عمل کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ ان دو رکوعوں میں ایک اعتبار سے مضمون مکمل ہو گیا ہے' اس لئے کہ چھٹا رکوع شروع ہو رہا ہے ﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ

© rasailojaraid.c

اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ﴾ کے الفاظ سے اور ساتواں رکوع ختم ہو رہا ہے ان الفاظ پر: ﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ...... ﴾ (الآیۃ)۔ چنانچہ یہاں کوئی عقیدہ والی بات نہیں آئی ہے۔ البتہ اب ہم جس حصہ کا آغاز کر رہے ہیں اس میں فکری اور نظریاتی باتیں بھی شامل ہیں‘ یعنی حالات و واقعات کا تجزیہ اور ان کی تہہ میں جو فکری اور نظریاتی غلطیاں کارفرما تھیں‘ اور ان کے عقائد میں جو کجی پیدا ہو گئی تھی اس کا بیان ہے‘ اور یہ حصہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس میں حکمت قرآنی کے بہت بڑے خزانوں پر مشتمل بہت قیمتی آیات شامل ہیں۔ اور یہ درحقیقت موجودہ اُمت مسلمہ کے لئے بھی ایک پیشگی تنبیہہ ہے کہ سابقہ اُمت مسلمہ جن غلط نظریات‘ عقائد‘ خیالات اور طرزِ عمل کی بنا پر اس انجامِ بد کو پہنچی ہے تم بھی کہیں اسی کو اختیار نہ کر لینا‘ کیونکہ ظاہر ہے غلط اعمال و افعال‘ غلط عقائد و نظریات کا ہی نتیجہ ہوتے ہیں۔ انسانی شخصیت کے یہ دو پہلو ہیں‘ ایک عقائد و نظریات اور دوسرے اعمال و افعال‘ جن کے درمیان گہرا رشتہ ہے۔ اگر کسی شخص سے غلط اعمال سرزد ہوتے ہیں تو یقیناً ان کے پیچھے اس شخص کے غلط افکار و نظریات ہیں۔ تو ان حصوں میں آپ دیکھیں گے کہ نہ صرف واقعاتی طور پر تجزیہ کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی تہہ میں جو فکری گمراہی ہے اس کی نشاندہی بھی کی جا رہی ہے۔ یہ گویا ایک عالمی سچائی اور ابدی حقیقت ہے جو بتائی جا رہی ہے۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی ایک روایت میں جو متفق علیہ ہے‘ نبی کریم ﷺ نے بتا دیا تھا کہ اے مسلمانو! تمہارے اندر بھی وہ خرابیاں پیدا ہوں گی جو پہلی اُمتوں میں پیدا ہوئیں۔ آپؐ نے فرمایا:

((لَتَتَّبِعُنَّ سَنَنَ مَنْ قَبْلَكُمْ شِبْرًا بِشِبْرٍ وَّذِرَاعًا بِذِرَاعٍ حَتّٰى لَوْ سَلَكُوْا جُحْرَ ضَبٍّ لَسَلَكْتُمُوْهُ)) قُلْنَا: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اَلْيَهُوْدُ وَالنَّصَارٰى؟ قَالَ: ((فَمَنْ!))

’’اے مسلمانو! تم بھی لازماً اتباع کرو گے انہی لوگوں کے طریقہ کا جو تم سے پہلے تھے‘ بالشت کے ساتھ بالشت اور ہاتھ کے ساتھ ہاتھ (جیسا کہ محاورہ ہے کہ تم انہی کے نقش قدم پر چلو گے) حتیٰ کہ وہ اگر کسی گوہ کے بل میں گھسے تھے تو تم بھی گھسو گے۔‘‘ صحابیؓ کہتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: ’’یارسول اللہ! کیا

© rasailojaraid.c

یہود و نصاریٰ؟'' (یعنی کیا آپ کی مراد یہود و نصاریٰ ہیں کہ ان کے اندر جو اعتقادی اور عملی خرابیاں تھیں وہ ہمارے اندر بھی آ جائیں گی؟) آپؐ نے فرمایا: ''اور کون؟''

گویا یہ ایک پیشگی تنبیہہ تو ہے ہی' ستم ظریفی کہئے کہ واقعہ بھی یہی ہے کہ وہی نظری واعتقادی گمراہیاں' وہی عملی خرابیاں' جو وہاں تھیں' یہاں بھی آ گئی ہیں۔ بہرحال جہاں تک تنبیہہ اور نشاندہی کا تعلق ہے ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔

آیت قرآنی سے غلط استدلال

اس تمہید کے بعد اب ہم اس حصہ کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِئِيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (آیت ٦٢)

© rasailojaraid.c

سورۃ البقرۃ کے آٹھویں رکوع کی اس پہلی آیت کو خاصی controversial اور مغالطہ آمیز بنا دیا گیا ہے۔ پہلے بھی جب کبھی اس طرح کا فتنہ اٹھا ہو گا تو اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہو گا۔ آیت زیر مطالعہ اور سورۃ المائدۃ کی آیت ۶۹ کے حوالہ سے ایک بہت بڑا فتنہ ''وحدتِ ادیان'' کھڑا کیا گیا تھا۔

فرمایا: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو مسلمان بنے۔'' میں نے یہاں ''جو ایمان لائے'' ترجمہ نہیں کیا' اس لئے کہ اہل ایمان سے مراد مسلمان ہیں' چاہے وہ حقیقت میں مؤمن ہوں یا منافق۔ جو صرف قانونی مسلمان ہوتے ہیں قرآن ان سے بھی ''اے ایمان والو'' کہہ کر خطاب کرتا ہے' اس لئے کہ قانونی ایمان تو انہیں بہرحال حاصل ہے۔ چنانچہ سورۃ النساء کی آیت ۱۳۶ ملاحظہ ہو:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾

''اے ایمان کے دعوے دارو! ایمان لاؤ (جیسا کہ ایمان لانے کا حق ہے) اللہ پر' اللہ کے رسولوں پر' اور اُس کتاب پر جو اُس نے اپنے بندے (ﷺ) پر

© rasailojaraid.c

نازل کی اور اس کتاب پر بھی جو اُس نے پہلے نازل کی۔“

تو آیت زیر مطالعہ کا ترجمہ یوں ہو گا:

”یقیناً جو لوگ مسلمان ہوئے‘ اور وہ جو یہودی ہوئے اور نصاریٰ اور صابی‘ جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور پچھلے دن پر اور جس نے بھی نیک عمل کئے‘ تو اُن کا اجر ان کے رب کے پاس محفوظ ہے‘ نہ ان کے لئے کوئی خوف ہے اور نہ وہ کسی حزن سے دوچار ہوں گے۔“

یہ اس آیۂ مبارکہ کا لفظی ترجمہ ہوا۔ یہ بات کئی دفعہ واضح کی جا چکی ہے کہ اہم مضامین قرآن حکیم میں کم از کم دو بار ضرور آتے ہیں‘ لہٰذا اس آیت کی ہم معنی آیت سورۂ مائدہ کی آیت ۶۹ ہے جس کے الفاظ بعینہٖ وہی ہیں جو سورۂ بقرہ کی مذکورہ بالا آیت کے ہیں‘ البتہ ترتیب میں معمولی سی تبدیلی ہے۔ سورۂ بقرہ میں نصاریٰ پہلے اور صابی بعد میں ہے وہاں صابی پہلے اور نصاریٰ بعد میں ہے‘ باقی الفاظ جوں کے توں یہی ہیں۔

اگر قرآن حکیم میں سیاق وسباق اور دیگر مقامات پر جو باتیں آئی ہیں ان سب کو نظر انداز کر دیا جائے اور صرف کسی ایک مقام یا آیت کو توجہ کا مرکز بنا کر اس سے اپنا ایک فلسفہ اخذ کرنے کی کوشش کی جائے تو ان الفاظ سے یہ مغالطہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص خواہ یہودی ہو‘ نصرانی ہو‘ صابی ہو‘ چاہے مسلمان ہو‘ جو کوئی بھی ایمان رکھتا ہو اللہ پر‘ یومِ آخر پر اور نیک عمل کرتا ہو تو اس کی نجات یقینی ہے۔ یعنی اس آیت کی رو سے رسالت پر ایمان لازم نہیں آتا۔ گویا محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا نجات کے لئے شرط لازم نہیں۔ اسے ”وحدتِ ادیان“ کا نام دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے نبوت و رسالت پر ایمان سے جو فرق آتا ہے وہ شریعت کا ہے۔ شریعت موسوی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے سے متعلق ہے‘ شریعت محمدی کا محمد ﷺ پر ایمان لانے پر انحصار ہے۔ چنانچہ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شریعت بھی غیر ضروری ہے۔ اللہ پر اور آخرت پر ایمان اور نیک عمل نجات کے لئے کافی ہے‘ کوئی شخص نماز پڑھتا ہے یا نہیں پڑھتا‘ کیسے پڑھتا ہے وغیرہ‘ یہ ثانوی چیزیں ہیں‘ نجات کے لئے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں!

یہ فتنہ ہمارے ہاں تین حوالوں سے آیا ہے۔ اوّلاً: تصوف میں ہمہ اوست کا

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

تصور۔ اگر یہ اصل شکل میں ہو تو پھر کسی مذہب، شریعت یا عبادت کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی۔ جیسا کہ مشہور مصرعہ ہے: ''مسجد، مندر ایکو نور''۔ یعنی مسجد اور مندر میں ایک ہی نور ہے۔ گویا جو بتوں کو پوجتے ہیں وہ بھی اسی ہستی باری تعالیٰ کو پوجنے والے ہیں، بت تو محض ایک ذریعہ ہیں، اپنی توجہ مرتکز رکھنے کے لئے بتوں کو ذریعہ بنایا گیا ہے ورنہ پوجا تو کسی اور ہستی یا ہستیوں کی کی جاتی ہے۔

ثانیاً: اکبرِ اعظم کا ''دینِ الٰہی'' کا فتنہ۔ یہ دونوں فتنے خاص طور پر ہندوستان میں ایک ہی وقت میں اُبھرے ہیں۔ اکبر اگرچہ اَن پڑھ تھا، مگر نہایت ذہین انسان تھا، اسے یہ محسوس ہو گیا تھا کہ مختلف مذاہب اور قومیتوں کی ہندوستان میں یہ جو کھچڑی پکی ہوئی ہے یہ اس کی عظمت اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے، لوگوں میں یکجہتی نہیں ہے اور وہ ایک قوم نہیں بن پا رہے، لہٰذا ان مذاہب کے ظاہری فرق و تفاوت کو ختم کر کے ایک ہی مذہب بنا دیا جائے، تاکہ آپس کی کھٹ پٹ کم ہو اور سیاسی اعتبار سے ہندوستان ایک عظیم ملک کی شکل اختیار کر سکے۔ چنانچہ اس مقصد کے لئے اس نے ''دینِ الٰہی'' ایجاد کیا جس کے لئے اس نے قرآن حکیم کا بھی سہارا لیا۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے علماء اسے یہ پٹی پڑھانے کے لئے موجود تھے۔

قرآن مجید میں دو جگہ یہ مضمون آیا ہے (سورۂ سجدہ اور سورۂ حج میں) کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تدبیرِ کائنات ہو رہی ہے، اس میں ہمارا ایک ہزار سال اللہ کے ایک دن کی حیثیت رکھتا ہے۔ اکبر کا کہنا تھا کہ اب دین محمدیؐ کو ایک ہزار سال پورے ہو گئے ہیں، محمد ﷺ کا لایا ہوا دین ایک ہزار سال کے لئے تھا لہٰذا اب وہ ختم ہو گیا اور اگلے ہزار سال کے لئے میرے ایجاد کردہ دین الٰہی پر عمل کیا جائے۔ اسی حوالے سے اسے ''الف ثانی'' یعنی دوسرا ہزار سالہ دَور کا نام دیا گیا۔ یہ واقعتاً بہت زبردست فتنہ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اپنے دین کی حفاظت کی ذمہ داری لے رکھی ہے، یہ آخری دین ہے، اب کوئی نبی تو آئے گا نہیں، البتہ مجدد دین کا سلسلہ جاری ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شیخ احمد سرہندیؒ سے ہند میں سرمایۂ ملت کی نگہبانی کا کام لیا۔ اسی لئے انہیں ''مجدد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الف ثانی'' کہا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے جداگانہ تشخص‘ شریعت کی اہمیت اور اتباع سنت کا مقام اجاگر کرنا حضرت مجدد الف ثانی ؒ کا بہت بڑا کارنامہ ہے‘ جس کا یہ نتیجہ تھا کہ اکبر کی موت کے ساتھ ہی دین الٰہی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

یہ فتنہ گزشتہ صدی میں ہندو مفکرین نے دوبارہ وحدتِ ادیان کے نام سے اٹھایا۔ اس کے لئے برہمو سماج کا تصور پیش کیا گیا‘ جسے گاندھی نے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا اور ہندوستان میں مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے کی کوشش کی تاکہ ایک متحدہ ہندوستانی قوم وجود میں آئے۔ موجودہ دور میں یہ فتنہ سیکولرزم کی شکل میں پیش کیا گیا ہے‘ یعنی یہ تصور کہ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے‘ اجتماعی نظام میں اس کا عمل دخل نہیں ہونا چاہئے‘ ہر ایک کو یہ آزادی حاصل ہے کہ جس مذہب کی چاہے پیروی کرے‘ جو چاہے عقیدہ رکھے‘ جس طرح چاہے عبادت کرے‘ البتہ سیاسی‘ معاشرتی اور معاشی زندگی کے اصول طے کرنا لوگوں کی آزاد مرضی پر منحصر ہے۔ گویا کہ جو بات دین الٰہی یا وحدتِ ادیان کے نام سے پیش کی جاتی رہی ہے اسے جدید انداز میں سیکولرزم کا نام دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس نظریہ کو تقویت فراہم کرنے کے لئے قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیت کا ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جانا پہلی مرتبہ نہیں ہے۔

اس تمام نظریہ کی نفی کے لئے پانچویں رکوع کی وہ آیات موجود ہیں جن میں یہود کو محمد ﷺ پر ایمان لانے کی پرزور دعوت دی گئی ہے اور جو بعد کے دس رکوعوں میں شامل آیات کے لئے ایک مشترک عنوان (Common Factor) کے طور پر لائی گئی ہیں۔

''وحدتِ ادیان'' کا قرآنی تصور

وحدتِ ادیان کا مذکورہ بالا نظریہ یقیناً پرلے درجے کی گمراہی ہے‘ تاہم وحدتِ ادیان کا جو تصور ہمیں قرآن حکیم سے ملتا ہے وہ یہ ہے کہ تمام انبیاء و رُسل کی دعوت دینِ اسلام ہی کی دعوت تھی۔ اس طرح کہ تمام ادیان اصلاً ایک ہیں‘ دنیا میں جتنے بھی ادیان ہیں ان کا origin ایک ہے۔ ظاہر ہے تمام انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور حضرت

آدمؑ اللہ کے نبی تھے‘ چنانچہ دنیا میں جتنے بھی انبیاء ورسل آئے ہیں وہ یقیناً دین اسلام کے ہی حامل تھے۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ پر جو لوگ ایمان لائے تھے وہ بلاشبہ دین حق کے پیروکار تھے۔ مثلاً سورہ یونس کی آیت ۱۹ میں فرمایا گیا:

﴿وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ؕ﴾

’’اور نہیں تھے تمام انسان مگر ایک اُمت‘ پھر انہوں نے باہم اختلاف کیا۔‘‘

یعنی ابتداءً سارے انسان ایک ہی اُمت تھے‘ بعد میں انہوں نے مختلف عقیدے اور مسلک بنا لئے۔

یہی مضمون اسی سورہ بقرہ میں مزید نکھر کر سامنے آتا ہے۔ فرمایا:

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (آیت ۲۱۳)

’’ابتدا میں سب لوگ ایک ہی طریقے پر تھے۔ (پھر یہ حالت نہ رہی اور اختلافات رونما ہوئے۔) تب اللہ نے نبی بھیجے جو (راست روی پر) بشارت دینے والے اور (کج روی کے نتائج سے) خبردار کرنے والے تھے‘ اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ (حق کے بارے میں) لوگوں کے درمیان جو اختلافات رونما ہو گئے تھے ان کا فیصلہ کرے —— (اور ان اختلافات کے رونما ہونے کی وجہ یہ نہ تھی کہ ابتدا میں لوگوں کو حق بتایا نہیں گیا تھا۔ نہیں) اختلاف ان لوگوں نے کیا جنہیں حق کا علم دیا جا چکا تھا۔ انہوں نے روشن ہدایات پالینے کے بعد محض اس لئے حق چھوڑ کر مختلف طریقے نکالے کہ وہ آپس میں زیادتی کرنا چاہتے تھے۔ پس جو لوگ (انبیاءؑ پر) ایمان لائے انہیں اللہ نے اپنے اِذن سے اس حق کا راستہ دکھایا جس میں انہوں نے اختلاف کیا تھا۔ اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔‘‘

چنانچہ یہ اختلاف اندھیرے میں نہیں ہوتا‘ باہم ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہوتا

© rasailojaraid.com

ہے' انسان جان بوجھ کر ٹھوکر کھاتا ہے' ایک دوسرے پر سبقت اور بالادستی حاصل کرنے کی خاطر حق سے اعراض کرتے ہوئے غلط راستے اختیار کرتا ہے' ورنہ یہ بات نہیں کہ حق نظر نہیں آتا۔ ابوجہل مانتا تھا کہ محمد ﷺ جھوٹ نہیں بولتے' لیکن خاندانی اور گروہی رقابت آڑے آتی تھی۔

شروع میں تمام انسان ایک تھے اور ایک ہی دین تھا۔ یہودیت' نصرانیت اور صابیت کا تعلق چونکہ اسی علاقے سے تھا جہاں قرآن حکیم نازل ہو رہا تھا اور اس لئے بھی کہ ان کا تعلق حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے تھا لہٰذا قرآن حکیم میں ان کا ذکر ہے' ورنہ دنیا کے دیگر مذاہب بھی اصلاً اسلام ہی تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد تو انہی کی نسل سے تمام انبیاء آئے ہیں لیکن ان سے قبل حضرت نوح علیہ السلام کی نسل سے بھی تو یقیناً انبیاء ہوں گے جن کے پیروکار دنیا میں رہے ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ اب ان کا اصل دین سے دُور کا تعلق بھی باقی نہیں رہ گیا' تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب دین اسلام ہی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔

وحدت کی انسانی خواہش اور اللہ تعالیٰ کی حکمت تخلیق

میرے نزدیک وحدتِ ادیان کی خواہش کا ابھرنا ایک فطری امر ہے' کیونکہ کوئی بھی انسان ایک دوسرے کے ساتھ مسلسل کشاکش یا محاذ آرائی کی حالت میں رہنا پسند نہیں کرتا' خاص طور پر آج کی دنیا میں اس خواہش نے شدت اختیار کر لی ہے' اس لئے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے نتیجہ میں مختلف خطوں کے درمیان فاصلے بالکل کم ہو کر رہ گئے ہیں' دنیا سکڑ کر ایک عالمی گاؤں (global village) کی شکل اختیار کر گئی ہے' اور یہ جو تفرقات ہیں' خصوصاً مذہب کی بنیاد پر' ان میں بڑی شدت ہوتی ہے۔ گویا یہ خواہش تو طبعی ہے' انسان مل جل کر امن و سکون کے ساتھ زندگی بسر کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ گاہے سیاسی ضرورت اور گاہے روحانی و مذہبی تقاضے کے طور پر مختلف اوقات میں یہ فلسفہ سامنے آتا رہا ہے' لیکن ہمارے لئے اصل بات یہ ہے کہ قرآن حکیم اس بارے میں کیا کہتا ہے۔ قرآن حکیم کی رو سے بات بالکل دوسری ہے' اللہ کا اپنا

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

الگ اصول اور تقاضا ہے' نہ کہ جو ہم چاہتے ہیں وہی اللہ کا بھی مقصد اور مدعا ہے۔فرمایا:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَهُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّدْخِلُ مَنْ يَّشَآءُ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ وَالظّٰلِمُوْنَ مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ﴾ (الشوریٰ:۸)

''اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا' مگر وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت میں داخل کرتا ہے' اور ظالموں کا نہ کوئی ولی ہے نہ مددگار۔''

اللہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک اُمت بنا دیتا' سب حقیقی مسلمان ہوتے' اللہ کے لئے یہ کوئی مشکل نہیں تھا' لیکن اللہ کے پیش نظر یہ ہے ہی نہیں' اللہ نے تو انسان کو امتحان اور آزمائش کے لئے پیدا کیا ہے' اس لئے جو انسان اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی کوشش کرے گا صرف اسی کو جنت میں داخلہ ملے گا' یہ نہیں کہ سب کے لئے جنت تیار کر رکھی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو انبیاءِ کرام اور کتابیں بھیجنے کی کیا ضرورت تھی' ایک ہی طرح سب انسانوں کو نیک بنا دیا جاتا۔

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ﴾ (النحل:۹۳)

''اگر اللہ کی مشیت یہ ہوتی (کہ تم میں کوئی اختلاف نہ ہو) تو وہ تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا' مگر وہ جسے چاہتا ہے گمراہی میں ڈالتا ہے اور جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے۔''

دونوں آیات میں تقریباً ایک جیسے الفاظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تخلیق ہی یہ ہے۔ یہ دُنیوی زندگی ایک آزمائش ہے' یہاں ایک درجہ بندی ہو کر رہنی ہے اور اس کی بنیاد یہی ہے کہ جو نیکی کا طلبگار رہوگا اللہ اسے ہدایت دے گا اور جو گمراہی کی روش اختیار کرے گا اسے گمراہی ملے گی۔

سورہ ہود کی آیات ۱۱۸'۱۱۹ ملاحظہ ہوں:

﴿وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۙ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ﴾

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

''اور اگر تیرا ربّ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی اُمت بنا دیتا' مگر اب تو وہ مختلف طریقوں پر ہی چلتے رہیں گے' سوائے ان کے جن پر تیرے ربّ کی رحمت ہے (وہ بے راہ رویوں سے بچتے رہیں گے) ـــــ اور اسی (آزادیٔ انتخاب واختیار اور امتحان) کے لئے تو اللہ نے انہیں پیدا کیا تھا۔''

آخری طور پر یہ مضمون سورۃ المائدہ میں آیا ہے جو مدنی سورہ ہے' پہلی تینوں مکی سورتیں تھیں۔ فرمایا:

﴿وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ﴾ (آیت ۴۸)

''اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں ایک اُمت بھی بنا سکتا تھا' لیکن اس نے یہ اس لئے کیا کہ جو کچھ اس نے تم لوگوں کو دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے' لہٰذا بھلائیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرو۔ آخر کار تم سب کو اللہ ہی کی طرف جانا ہے' پھر وہ تمہیں اصل حقیقت بتا دے گا جس میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔''

لہٰذا اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہمیں یہ بات خواہ کتنی ہی بھلی نظر آئے اور کتنی ہی وقتی تقاضوں پر مبنی محسوس ہو لیکن تمام انسانوں کا ایک اُمت ہونا اللہ تعالیٰ کے مقصدِ تخلیق کے منافی ہے۔ یہاں تو سیدھی سیدھی بات ہے کہ جو حق ہے اس کا بول بالا کرو' اس پر جمے رہو' ڈٹے رہو' محض رواداری' یکجہتی یا کوئی اتحاد پیدا کرنے کے لئے لچک دکھانا اور کچھ give and take کرنا حق سے انحراف اور مداہنت ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ کو فرمایا گیا:

﴿فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۞ وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ ۞﴾ (القلم: ۸'۹)

''آپ ان جھٹلانے والوں کے دباؤ میں ہرگز نہ آئیں۔ یہ تو چاہتے ہیں کہ آپ کچھ ڈھیلے پڑیں تو یہ بھی (آپ کی مخالفت میں) کچھ نرمی اختیار کر لیں۔''

وہ تو چاہتے ہیں کہ آپؐ مداہنت کریں' لیکن آپؐ ہرگز ان کی باتوں پر توجہ نہ دیجئے اور ڈٹے رہئے' جس کا آپؐ کو حکم دیا گیا ہے۔

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

اس کا تعلق اس حدیث سے بھی جڑتا ہے جس میں فرمایا گیا کہ ((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا)) اسلام کا آغاز اس حال میں ہوا تھا کہ غریب یعنی اجنبی تھا۔ جاننے پہچاننے والے کم تھے۔ پھر اسے غلبہ حاصل ہوا اور جسے غلبہ حاصل ہو اُس کے سبھی دوست ہوتے ہیں۔ فرمایا: ((وَسَيَعُوْدُ غَرِيْبًا كَمَا بَدَأَ)) اسلام عنقریب ایسا ہی ہو جائے گا جیسا شروع میں اجنبی تھا۔ مسلمان اگرچہ بہت ہوں گے' مگر اسلام غریب ہوگا۔ آج دنیا میں ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ مسلمان ہیں' لیکن اسلام کہاں ہے؟ چنانچہ اسلام کے مطابق کوئی شخص زندگی گزارنا چاہے گا تو وہ معاشرے میں اجنبی ہو کر رہ جائے گا۔ آپ اس کا فیصلہ کر لیں تو آپ کے قریب کوئی نہیں آئے گا' لوگوں کو آپ کے ساتھ رشتہ داری پسند نہیں ہوگی' آپ کو دقیانوسی اور رجعت پسند شمار کیا جائے گا۔ تو فرمایا: ((فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ)) پس مبارکباد ہے ان لوگوں کو جو خود اجنبی بننا گوارا کر لیں لیکن اسلام کا دامن نہ چھوڑیں۔ (مسلم' بروایت ابو ہریرہؓ)

© rasailojaraid.c

میثاق النبیین

اب اس سلسلہ میں ایک اور دلیل نوٹ کیجیے اور وہ ہے ''میثاق النبیین'':

﴿وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ﴾ (آل عمران: ۸۱)

''ذرا یاد کرو جب اللہ نے تمام نبیوں سے یہ عہد لیا تھا کہ جو کچھ میں نے تمہیں کتاب اور حکمت سے عطا کیا ہے' پھر تمہارے پاس وہ رسول آئے جو اس کی تصدیق کرنے والا ہو جو تمہارے پاس ہے تو تم کو اس پر ایمان لانا ہوگا اور اس کی مدد کرنی ہوگی۔ فرمایا کہ کیا تم نے اقرار کیا اور اس شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ انہوں نے کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا تو اب گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں''۔

اللہ تعالیٰ نے تمام نبیوں سے ایک عہد لیا تھا' جیسا کہ میثاقِ الست تھا جو تمام

© rasailojaraid.c

انسانوں سے لیا گیا تھا اور جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کے جسمانی وجود سے بہت پہلے ارواحِ انسانی پیدا کی گئی تھیں۔ اسی طرح انبیاء کرام کی ارواح سے یہ عہد لیا گیا تھا کہ جب میں تم میں سے کسی کو کتاب اور حکمت دوں گا اور اس کے بعد کوئی اور نبی آئے گا جو تصدیق کرے گا اس کی جو اس سے پہلے انبیاء کو دیا گیا تھا تو تم لازماً اس پر ایمان لاؤ گے اور لازماً اس کی مدد کرو گے۔ مطلب یہ کہ ایک نبی آئے' اللہ نے انہیں کتاب دی' حکمت سے نوازا' ان کے جو پیروکار ہیں وہ ایک اُمت بن گئے' اب ان کے بعد ایک اور نبی آ گئے' تو سابقہ انبیاء کے پیروکاروں پر لازم ہے کہ نئے آنے والے نبی پر ایمان لائیں اور ان کے دست و بازو بنیں۔ اللہ نے آخر میں سوال کیا: کیا تم نے اقرار کیا اور میرے اس عہد اور میثاق کو قبول کیا؟ تو انہوں نے کہا: ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا: تو گواہ رہنا اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ رہوں گا۔ ہر نبی کے ذریعے سے اس کی اُمت سے جب اللہ نے یہ عہد لیا ہے تو یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ بس نجات کے لئے اپنے اپنے نبی پر ایمان رکھنا کافی ہو جائے گا۔ یہ تصور اس آیہ مبارکہ کی قطعی نفی ہے۔

© rasailojaraid.c

بنی اسرائیل کا اللہ تعالیٰ سے عہد

خاص طور پر بنی اسرائیل کا جو عہد تھا اس کو بھی نوٹ کر لیجئے۔ سورۃ بقرہ کے پانچویں رکوع میں بنی اسرائیل سے جو کہا جا رہا ہے کہ ﴿وَاَوْفُوْا بِعَھْدِیْٓ اُوْفِ بِعَھْدِکُمْ﴾ ''تم میرا عہد پورا کرو تاکہ میں تم سے اپنا عہد پورا کروں'' وہ کون سا خصوصی عہد تھا جو بنی اسرائیل سے ہوا ہے۔ اس ضمن میں سورۃ اعراف کی آیات ۱۵۶۔۱۵۸ بہت اہم ہیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام کی قوم پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت آئی اور حضرت موسیٰؑ اپنی قوم کے چیدہ افراد کو لے کر کوہ طور پر گئے تو وہاں انہوں نے درخواست پیش کی تھی کہ: ﴿وَاکْتُبْ لَنَا فِیْ ھٰذِہِ الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ اِنَّا ھُدْنَآ اِلَیْکَ﴾ ''اے ربّ! ہمارے لئے اس دنیا اور آخرت کی زندگی میں خیر اور بھلائی مقدر کر دے' ہم تیری ہی جناب میں رجوع کرتے ہیں۔'' اس لفظ (ھُدْنَا) کو نوٹ کیجئے' اس لئے کہ اس لفظ کا یہود کے ساتھ بھی تعلق ہے' یعنی لوٹنا' رجوع کرنا' پلٹنا۔

© rasailojaraid.c

© rasailojaraid

﴿قَالَ عَذَابِيْ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ؕ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۞ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۫ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۞﴾ (الاعراف:۱۵۶-۱۵۷)

"(اللہ تعالیٰ نے جواب میں) فرمایا: جہاں تک میرے عذاب کا تعلق ہے وہ تو میں دوں گا جس کو چاہوں گا، مگر میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے۔ (یعنی میری یہ رحمت سب کے لئے عام ہے' ہر شے کا وجود میری رحمت کا ہی مرہونِ منت ہے) لیکن میری خاص رحمت ان لوگوں کے لئے ہے جو تقویٰ کی روش اختیار کریں گے' زکوٰۃ ادا کریں گے اور ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔ اور وہ لوگ جو اتباع کریں گے اس پیغمبر' نبی اُمیؐ کا جس کا ذکر وہ موجود پائیں گے اپنے ہاں (پیشین گوئی کے طور پر) تورات اور انجیل دونوں میں لکھا ہوا۔ وہ انہیں نیکیوں کا حکم دے گا' بدی سے روکے گا' تمام پاکیزہ چیزوں کو ان کے لئے حلال ٹھہرائے گا اور ناپاک ونجس چیزوں کو حرام قرار دے گا' اور ان پر پڑے ہوئے ناروا بوجھ ان سے اتارے گا اور انہیں ان بندشوں سے نجات دلائے گا جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے۔ لہٰذا جو لوگ ان پر ایمان لائیں گے' ان کی تعظیم کریں گے' مدد کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو ان کے ساتھ نازل کیا جائے گا' وہی لوگ فلاح پائیں گے۔"

بنی اسرائیل سے یہ عہد محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے لئے لیا گیا تھا۔ چنانچہ اگلی آیت میں نبی کریم ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعَا ۨ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۞﴾

''(اے نبیؐ! ڈنکے کی چوٹ) کہیے کہ اے لوگو! میں تم سب کے لئے اس اللہ کا رسول ہوں جس کی بادشاہی تمام زمین و آسمان پر ہے' اس کے سوا کوئی معبود نہیں' وہی زندگی اور موت دینے والا ہے' پس ایمان لاؤ اس نبی اُمّی رسول پر جو اللہ اور اس کے ارشادات پر ایمان رکھتا ہے (اللہ کی تمام سابقہ کتابوں پر ایمان رکھتا ہے) تا کہ تم فلاح سے ہمکنار ہو۔''

قرآن حکیم کی متذکرہ بالا آیات کی روشنی میں درج ذیل نتائج حاصل ہوتے ہیں:

۱) سیاق وسباق سے ہٹ کر صرف کسی ایک آیت سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانا نجات کی شرط لازم نہیں ہے' محض کجی اور گمراہی ہے۔

۲) انبیاء کرام علیہم السلام سے لئے گئے عہد کی رو سے ہر نئے آنے والے نبی پر ایمان لانا لازم تھا۔

۳) بنی اسرائیل سے خاص طور پر یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ نبی آخرالزماں' محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائیں گے۔

زیر مطالعہ آیت کا اصل مفہوم

اب ذرا اس آیت زیر مطالعہ کے الفاظ پر بھی غور کر لیں۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا﴾ ''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے۔'' مراد مسلمان ہیں۔ ہمیں درحقیقت یہ دیکھنا ہے کہ یہ آیت کس مقصد اور مفہوم میں یہاں آئی ہے۔ تمام انسانوں اور اُمتوں کا ایک مشترک روگ یہ ہے کہ وہ کسی ملت یا اُمت میں شامل ہونے کے بعد اس زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ان کی نجات کا انحصار صرف اس اُمت میں شمولیت پر ہے حالانکہ اُمت میں شامل ہونا اخروی نجات کی قطعاً ضمانت نہیں ہے' کیونکہ اخروی نجات کے لئے اپنا ذاتی ایمان اور نیک عمل کا ہونا لازم ہے۔ یہ تصور کہ چونکہ ''تیرے محبوب کی اُمت سے ہیں'' لہٰذا جنت ہمارا حق ہے' عمل خواہ کچھ بھی ہو' ایک باطل تصور ہے۔ یہ مغالطہ بنی اسرائیل کو ہوا اور ہر ایک کو ہو جاتا ہے' حالانکہ ایک شخص اللہ کے نبی ﷺ کے ساتھ مل کر دشمن کے ساتھ جنگ کرتے ہوئے شہید ہو جاتا ہے' لوگ کہتے ہیں کہ سیدھا جنت میں گیا' لیکن نبی ﷺ فرماتے ہیں: میں نے اسے جہنم میں

© rasailojaraid.com
© rasailojaraid.com

دیکھا ہے' اس لئے کہ زخموں کی تاب نہ لا کر اس نے خودکشی کر لی تھی جو حرام ہے۔

نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا: کوئی شخص اپنی شجاعت اور بہادری کے اظہار کے لئے جنگ کرتا ہے' کوئی حمیّت جاہلی کی وجہ سے' کسی خاص قبیلہ سے خاندانی دشمنی کی بنا پر' کوئی مال غنیمت کی طلب میں' ان میں سے کون مجاہد فی سبیل اللہ شمار ہوگا؟ فرمایا: کوئی بھی نہیں' بلکہ ((مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) یعنی جہاد فی سبیل اللہ صرف اور صرف اللہ کے دین کی سربلندی کے لئے ہوگا۔ میں نے اپنی کتاب ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی' حال اور مستقبل'' میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ دنیا میں قوموں پر جو عذاب آتا ہے وہ اجتماعی ہوتا ہے لہٰذا اس میں گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً ۚ﴾ (الانفال:۲۵) ''ڈرو اس عذاب سے جو صرف ظالموں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا۔'' لیکن اس کے بالکل برعکس آخرت کا معاملہ فرداً فرداً ہوگا۔ یعنی دنیا میں اجتماعی مگر آخرت میں انفرادی معاملہ ہوگا۔

© rasailojaraid.

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اُمت موسوی ہی اُمت مسلمہ تھی' مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد یہود کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانا لازم تھا۔ اسی طرح محمد رسول اللہ ﷺ کی آمد تک حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے اُمت مسلمہ تھے جبکہ اس کے بعد محمد ﷺ پر ایمان لانا شرط لازم ہے۔ البتہ نجاتِ اُخروی کا انحصار نہ حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ کی اُمت میں ہونے پر تھا اور نہ اب اُمت محمدؐ میں ہونے پر ہے۔ لہٰذا مذکورہ آیت سے جن مضامین کا آغاز ہو رہا ہے ان کا تعلق انہی غلط نظریات اور تصورات کی نفی سے ہے۔ اس کے بعد وہ مضامین ہیں جن کا تعلق اہل یہود پر تاریخی حوالہ سے ان کی واقعاتی غلطیوں کی بنا پر عائد کردہ فردِ جرم سے ہے۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا﴾ کے بعد فرمایا: ﴿وَالَّذِيْنَ هَادُوْا﴾ اب دیکھئے یہاں لفظ بنی اسرائیل نہیں آیا' بلکہ الَّذِيْنَ هَادُوْا آیا ہے' اور یہ وہ الفاظ ہیں جو حضرت موسیٰؑ نے دینِ حق پر ہونے کی بنیاد پر استعمال کئے تھے ﴿اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ﴾۔ اگرچہ یہودیوں

© rasailojaraid.

نے اپنے لئے حضرت یعقوبؑ کے چوتھے بیٹے یہووا کی نسل سے ہونے کو بنیاد بنایا ہے۔ یہی نام عیسائیوں کے ایک فرقہ کا بھی ہے ''یہوواز وٹنیسز'' (JEHOVAS WITNESSES) 'یہوا اللہ کے نام کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ بہرحال یہ جو مسلک بنا' اس میں صرف بنی اسرائیل ہی نہیں' ان کے طور طریقوں کی پیروی کرنے والے دوسرے لوگ بھی شامل ہیں۔ اس لئے یہاں لفظ بنی اسرائیل نہیں آیا۔

اس کے بعد ﴿وَالنَّصٰرٰی﴾ یہ لفظ ﴿نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ﴾ سے ماخوذ ہے۔ اگرچہ ایک دوسری نسبت بھی ہے جو ناصرہ یا نصران نام کے ایک قصبہ کے حوالہ سے ہے' یہ قصبہ بیت المقدس سے ۷۰ میل شمال میں بحیرہ روم کے ساحل سے ۲۰ میل کے فاصلہ پر تھا اور اب بھی موجود ہے' اسے نصارت بھی کہتے ہیں اور اسی کی نسبت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو مسیح ناصری (Jesus of Nazaret) کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ حضرت مریمؑ کا تعلق اسی قصبہ سے تھا' لیکن قرآن مجید کی رو سے لفظ نصاریٰ کا تعلق ''انصار اللہ' سے ہے۔ ''نصاریٰ'' حضرت مسیحؑ کے خلیفہ برحق پیٹر یا شمعون کے پیروکار تھے جو حضرت عیسیٰؑ کے اصل دین پر تھے اور وہ بہت عرصہ تک ''نضارین'' بھی کہلاتے رہے۔ سینٹ پال' جو عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ان کا شدید دشمن تھا' بعد میں اس نے کہا کہ مجھے رؤیاء ہوا ہے اور میں نے حضرت مسیحؑ کا دین اختیار کرلیا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کے دین میں ساری تبدیلیاں اسی کی پیدا کردہ ہیں اور اس کے ایجاد کردہ دین کو ماننے والے اب عیسائی (Christians) کہلاتے ہیں۔ قرآن مجید میں ہمیشہ لفظ نصاریٰ (Nazaren) آیا ہے۔ حضرت مسیحؑ کو ماننے والے اصل وہ تھے' لہٰذا قرآن صرف ان کا نام لے رہا ہے اور اس حوالہ سے یہ آیت نازل ہو رہی ہے' یعنی جو ان میں شامل تھا وہ اپنے ایمان اور عمل کے ناطے پائے گا' جو پائے گا۔ ظاہر بات ہے جب ان سب کا الگ الگ نام لے کر کہا جا رہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اُس وقت جو اصل دین کے پیروکار تھے ان کا یہ معاملہ ہے۔ ان میں کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے تھے اور کچھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے' جبکہ ہم حضرت موسیٰؑ' حضرت عیسیٰؑ اور حضرت محمد ﷺ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid

سب کے ماننے والے ہیں۔ چونکہ یہ چیز مشترک تھی اس لئے صرف ایمان اور نیک اعمال کی بات کی گئی ہے۔

صابئین کے بارے میں ہمارے ہاں بہت سے اقوال اور آراء پائی جاتی ہیں۔ اب چونکہ اس نام سے دنیا میں کوئی فرقہ موجود نہیں ہے' لہٰذا اختلافِ رائے کا ہونا غیر معمولی بات نہیں' البتہ ایک بات یقینی ہے کہ یہ بھی اہل کتاب میں سے تھے کیونکہ ان کا تذکرہ یہود و نصاریٰ کے ساتھ کئے جانے کا مطلب ہی یہ ہے۔ نیز حضرت عمر اور عبداللہ بن عباس (رضی اللہ عنہم) کا قول بھی یہی ہے اور امام ابوحنیفہؒ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ یہ اہل کتاب ہیں اور ان کا ذبیحہ کھانا جائز ہے۔ ان کے بارے دو آراء زیادہ نمایاں ہیں' ایک یہ ہے کہ یہ اپنے آپ کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی اُمت کہتے تھے اور نزول اسلام کے وقت یہ لوگ ایران اور شام کی سرحد پر کہیں کہیں موجود بھی تھے۔ لیکن میرے نزدیک دوسری رائے زیادہ قرین قیاس ہے' وہ یہ کہ یہ لوگ براہِ راست حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اپنے آپ کو منسوب کرتے تھے' اس لئے کہ اس آیت میں حضرت محمد ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمتوں کا نام آیا ہے اور ان اولوالعزم پیغمبروں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی شامل ہیں' جن کا تعلق اسی علاقہ سے تھا' تو ان کے ساتھ بھی کچھ لوگ رہے ہوں گے جو حضرت ابراہیمؑ سے تو اپنے آپ کو منسوب کرتے رہے لیکن ان کے بعد دوسرے کسی پیغمبر پر ایمان نہ لائے۔ آپ کو معلوم ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ایک نسل حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی چلی ہے جو حجاز میں آباد تھی۔ اس نسل میں اڑھائی ہزار سال تک کوئی نبی اور رسول نہیں آئے' لہٰذا یہ کہتے تھے کہ ہم حنیفی یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں' گو ان کے پاس نہ کوئی صحیفہ تھا نہ شریعت' اور وہ بدترین شرک میں مبتلا تھے' لیکن آخر اللہ کی رحمت جوش میں آئی اور انہی میں آخری نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ مبعوث ہوئے۔ دوسری شاخ حضرت اسحاق علیہ السلام سے ہے' جس میں دراصل انبیاء و رسل کا تسلسل رہا' اگرچہ حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ کے درمیان معلوم ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ منقطع رہا ہے اور اس دوران اس نسل میں بھی کوئی نبی نہیں ہوا'

لیکن پھر حضرت موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کے درمیان دوبارہ یہ سلسلہ تسلسل کے ساتھ جاری رہا ہے۔ نسل انسانی کا یہ چودہ سو سالہ عرصہ اس لحاظ سے بڑا عجیب ہے کہ اس میں نبوت کا تار کہیں ٹوٹا ہی نہیں۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں نبی کریم ﷺ کی ایک مشہور حدیث ہے:

((كَانَتْ بَنُوْ اِسْرَاءِيْلَ تَسُوْسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ ، كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ))

''بنی اسرائیل کی قیادت ہمیشہ انبیاء کے پاس رہی ہے' جب بھی ایک نبی فوت ہو جاتا تو ان کی جگہ دوسرا نبی موجود ہوتا۔''

بلکہ اس سنہری زنجیر کے آغاز میں اور آخر میں بیک وقت دو دو نبی موجود تھے۔ حضرت موسیٰؑ کے ساتھ حضرت ہارونؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ حضرت یحییٰؑ۔ بہر حال یہ تو ایک بہت ہی غیر معمولی واقعہ ہے' لیکن آپ کو معلوم ہے حضرت ابراہیمؑ کی ایک تیسری بیوی بھی تھیں اور ان سے بھی اولاد ہوئی ہے جو بنی قتورہ کہلاتی تھی۔ ان میں سے ایک شاخ کا تو ہمیں معلوم ہے' جس میں مدین یا مدیان ان کے ایک بیٹے تھے جن کی نسل میں حضرت شعیبؑ کی بعثت ہوئی ہے' لیکن ان کی دوسری اولاد بھی اسی علاقہ میں کہیں آباد تھی۔ اس میں یا تو آگے کوئی نبی نہیں آئے' یا پھر قرآن میں ان کا تذکرہ نہیں ہے اور اگر ان میں کوئی نبی نہیں آئے تو ان میں جو لوگ رہے وہ میرے نزدیک صابئین ہیں جو حضرت ابراہیمؑ کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرتے رہے۔ اور وہی علاقہ ہے عراق اور شام کا جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد آباد رہی۔ اسی علاقہ میں حضرت یعقوب ابن اسحٰق علیہما السلام کی نسل مصر سے واپس آنے کے بعد رہی ہے' فلسطین میں ان کی حکومت بھی قائم ہوگئی۔ اس لئے حضرت ابراہیمؑ کی تیسری نسل سے جو لوگ تھے وہ ذرا ہٹ کر شام اور عراق کے سرحدی علاقوں میں آباد ہو گئے۔

بہر حال اس آیت کا اصل مفہوم اس طرح ہے: ''یقیناً وہ لوگ جو اسلام لائے اور وہ جو یہودی ہوئے' اور وہ جو نصرانی ہوئے اور جو صابی رہے' ان میں سے جو بھی ایمان لایا اللہ پر اور یومِ آخر پر (یعنی اپنے اپنے وقت میں' اپنے اپنے دَور میں) اور اس نے عملِ صالح کی روش اختیار کی تو اللہ کے ہاں ان کا اجر محفوظ ہے' ان کے لئے نہ کوئی خوف ہے' نہ حزن''۔

(باقی صفحہ 48 پر)

© rasailojaraid.com